Woodbrooke Series.

The Place of Authority in Religion.

By Prof. Lootfy Levonian.

مذہب میں اختیار واقتدار کا درجہ

مصنّف

پروفیسر لطفی لیوونیان صاحب

مقیم بیروت

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی

انارکلی - لاہور

The Punjab Religious Book Society,

Anarkali, Lahore.

THE PLACE OF AUTHORITY IN RELIGION.

مذہب میں اقتدار و اختیار کا درجہ

مذہب میں اقتدار و اختیار کا کیا درجہ ہے؟ مذہب کے متعلق بحث کرنے میں سب سے اہم ترین اور دلچسپ مسئلہ یہ ہے کہ مذہب میں اختیار کا کیا درجہ ہے اور اسی وجہ سے اس قضیہ کا مطالعہ کرنا اور اس پر غور و خوض کرنا ازبس ضروری ہے۔

مثلاً ایک نوجوان جب فوجی خدمت کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے خویش و اقارب اور سابقہ کاروبار کو ترک کر دیتا ہے اور جونہی کہ وہ لباس نظامی کو زیب تن کرتا ہے وہ دوسرے کے حکم اور مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کی نشست و برخاست خواب اور خورد و نوش غرضیکہ اس کی تمام جزویات زندگی کلیتہً حاکم کی رضا و اختیار کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اُن ممالک میں جہاں حاکم وقت مطلق العنان ہوتا ہے۔ تمام رعایا بغیر حیل و حجت جملہ قواعد و قوانین کی متابعت کرتی ہے۔ قانون سب چیزوں سے بالاتر ہے۔ وہ فرمانبرداری و اطاعت کا متقاضی ہوتا ہے اور کسی قسم کے اعتراضات کو قبول نہیں کرتا۔ یہی

ایک خود مختارانہ حکومت کے قیام و استقلال کی ضروری اور لازمی شرط ہے۔ جس طرح تنظیم نظامی (فوجی) میں ایک افسرِ اعلیٰ کل اختیارات رکھتا ہے اور بادشاہ علی الاطلاق کے لئے قانونِ مطلق کی ضرورت ہے اسی طرح دیکھنا یہ ہے کہ مذہب میں بھی ایسی طاقت موجود ہے یا نہیں جو اُس اختیار اور قانون کا اظہار کرے جس پر مذہبی زندگی کا انحصار ہے۔ یعنی یہ کہ مذہب ہماری انسانی شخصیت کے ایک خارجی طاقت کی غلامی میں رہنے کی تائید کرتا ہے یا وہ ہماری شخصی آزادی کے موافق ہے؟ اب ہم اسی مسئلہ اساسی کے متعلق بحث کرینگے۔

قدیم الایام سے انسان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں ہمیشہ کسی نہ کسی خارجی طاقت کے ماتحت رہا ہے۔ تمدن کی تاریخ سے یہ امر روشن ہوتا ہے کہ انسان خانہ بدوشی کی زندگی سے شروع ہوکر ہمیشہ ایک حاکمِ مطلق یا رضای مطلق کے زیرِ حکم رہتا آیا ہے۔ خانقاہوں اور نیز مکتبوں کی تنظیم میں بھی مطلق العنانی رہی اور پادریوں اور معلموں نے ایسے انتظامات کی تائید کی۔ انسان کی زندگی کا سب سے پاکیزہ ترین پہلو اُس کی خانگی زندگی ہے لیکن خانگی زندگی میں بھی یہی قاعدہ اور دستور رائج رہا ہے اور فضیلت اور بزرگی کا اُصول شوہر اور بیوی کے باہمی تعلقات اور والدین اور اولاد کے باہمی رشتہ کا فیصلہ کرتا رہا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ انسان کی تاریخ میں عوام اور حکام ہر دو نے اسی سرداری اور حکومت کے اُصول کی طرفداری کی ہے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ یہ اُصول طرفین کے لئے گویا قانونِ قدرت بن گیا ہے۔ یہانتک کہ اکثر لوگ اِس اُصول کو درست کرنے اور اس کی صورت کو بدلنے کی کوشش کو قوم کی تباہی

اور بربادی خیال کرتے ہیں۔ انسان کی مذہبی زندگی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ مذہبی زندگی میں لوگوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے اختیار کے تابع رکھنا جو اُن کے نزدیک ایک قسم کی مخفی طاقت سے معمور ہوتا ہے باعث عزت سمجھا ہے۔ اور اُنھوں نے آنکھیں بند کر کے اس کے احکام اور شریعت کی فرمانبرداری کو انتہائی مسرت کا سرچشمہ سمجھا ہے۔ خداوند کریم۔ انبیاء۔ کُتب سماوی اور راہبوں کے متعلق انسان کے عقائد عموماً اسی بناء پر قائم ہیں۔ اور لوگوں کو اس سے کامل تسلی ہوتی رہی ہے۔ جس طرح زندگی کے دیگر شعبوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان قدرتاً اپنے آپ کو کسی بیرونی طاقت کے ماتحت کر لیتا ہے وہی کیفیت اطاعت مذہب میں ہے اور اکثر اوقات اِس مطلق العنانی کے متعلق شک و شُبہ کرنا (یا اعتراض کرنا) مستحسن نہیں سمجھا گیا۔

لیکن تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ عقل انسانی کی تدریجی ترقی کے ساتھ حُریت کا پاک جذبہ پیدا ہوتا گیا اور زندگی کے ہر شعبہ میں انسان نے اِستبداد سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ تمدن ایک طرف تو گویا حلقۂ استبداد سے نکلنے کی مسلسل جد و جہد اور تدریجی کامیابی کی تاریخ ہے اور دوسری طرف شخصی آزادی (حُریت) کے قیام کی بلکہ مذہب اور سائنس کی وہ ترقی جس نے گذشتہ چند صدیوں میں عقلی دُنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا درحقیقت ماسوای اس کے اور کچھ نہ تھی کہ محض سائنس کے تجسّس اور تحقیقات میں ایک خارجی اختیار مطلق کے ماتحت ہونے سے اِنکار اور اس کے برخلاف اعتراضات کا انبار۔ اِس کے بعد حکمت طبعی کا مطالعہ آزاد خیالی اور عمومی مشاہدات کی بناء پر نمایاں ترقی کا باعث ہوا۔ دَورِ حاضرہ

میں شخصی آزادی کی خواہش اور تنافر استبداد فقط سائنس اور علم تک ہی محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو یعنی تمدنی اور سیاسی اور دیگر پہلوؤں تک سرایت کر چکا ہے اور لازماً مذہب بھی اُس سے خالی نہیں رہا۔ انسان کی شخصیت قدرتاً ایک خودی کا وجود ہے یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے کاروبار کے ایک حصّہ کو بحالت غلامی اور دوسرے حصّہ کو مردِ آزاد کی مانند رکھے۔ وہ شکوک اور شبہات جو اُسے کام کے ایک جُزو کے متعلق ستاتے ہیں اسی طرح دیگر اجزا کے متعلق بھی آزادی کے ساتھ اُس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس کے موجودہ مشاہدات کی رُو سے متعدد اصول معاشرت اور تصوّرات متعلق سائنس جو کسی بیرونی اقتدار پر مبنی تھے معدوم ہو گئے ہیں اور یُوں بہت سے غور کرنے والوں نے مذہبی اعتقادات کی حقانیت کے متعلق سوال پُوچھنے شروع کر دیئے ہیں بلکہ اُن کے دلوں میں اس کے متعلق شکوک و شبہات بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔ چونکہ ان حالات کے مقابل جو لوگ خارجی اقتدار کے حامی تھے اس تحریک سے مضطرب ہو گئے۔ لہٰذا اُنہوں نے ان اعتقادات کی حفاظت کے زعم میں ادنیٰ سے ادنیٰ سوال کرنا بھی مذہب کے انکار سے مترادف سمجھا۔ اس ظلم و تعدّی کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جو اس اندیشے کے زیر اثر ہو کر اپنے آپ کو اس بیرونی اور تحکمی اقتدار سے آزاد کرنا چاہتے تھے اُنہوں نے شک و شبہ کو اِس قدر جگہ دی کہ وہ مذہب کو محض بے معنی تصوّر کرنے لگے۔ فی زمانہ مذہب کے متعلق یہ سوال نہایت اہم سوال بن گیا ہے۔ زندگی کے دیگر پہلوؤں کی مانند لوگ ان دونوں خیالوں میں سے ایک کی تقلید کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یا تو وہ اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ مذہب میں ایک بیرونی اقتدار ہے اور مذہب فقط اسی اختیار مطلق سے

دائم و قائم رہ سکتا ہے یا خیالات کے دیگر پہلوؤں کی مانند وہ اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ مذہب ایک بیرونی اقتدار ہے بلکہ مزید برآں یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس طرح لوگ مذہب جیسے اہم مسئلہ کا جو ہماری زندگی کے ہر ایک پہلو سے وابستہ ہے لحاظ کرتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں کہ یا تو وہ مجبوراً مذہب کو قبول کریں اور اُس خارجی اقتدار کے تابع رہیں یا بیرونی اختیار کا انکار کرنے کے ساتھ ہی مذہب کا بھی انکار کر دیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس مشکل کو کس طرح حل کر سکتے ہیں؟ مذہب کی جانب ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

ہر ایک سوال میں مقصد کے مطابق ہی ذرائع کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم پانی کی قدرتی خاصیتوں اور اس کی کیمیائی ترکیب کے بارے میں کسی کو سکھانا چاہیں تو پہلے ہم اُسے پانی کی نسبت کچھ بتاتے ہیں اور پھر اُسے یہ صلاح دیتے ہیں کہ پانی کے متعلق علم کیمیا اور علم طبعی کی کتابوں میں پڑھے۔ اس طرح وہ شخص پانی کے بارے میں سیکھتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو فن شناوری سیکھنا چاہتا ہے۔ کتابوں کے ذریعہ سے اس کو عملی طور سے ہرگز نہیں سیکھ سکتا خواہ اُن کتابوں میں اُس کے متعلق کتنے ہی قاعدے کیوں نہ لکھے ہوں۔ پانی کے متعلق قیاسی علم سیکھنے کی نسبت وہ پانی کے اندر داخل ہو کر اور وہاں ہاتھ پاؤں مار کر خود اپنے تجربہ سے کہیں زیادہ جلد تیرنا سیکھیگا بہ نسبت اس کے کہ وہ پہلے پانی کے متعلق قیاسی علم حاصل کرے۔ شناوری کے فن کا سیکھنا پانی کے علم سے ممکن نہیں ہو سکتا بلکہ اُس کے لئے پانی پر صحیح طریق سے سہارا لینے کے علم کی ضرورت ہے۔ اچھے تیراک بننے کے لئے ذاتی تجربہ چاہیے۔ مذہب کا مضمون بھی ایسا ہی ہے۔ پس

اس مضمون کے متعلق یہ نکتہ کہ آیا مذہب میں اقتدار خارجی ہے یا نہیں ہے اس امر کا فیصلہ کریگا کہ مذہب سے کیا مراد ہے اور متدین ہونے سے کیا اور ہمارا مقصد کیا ہے ۔ اگر مذہب بیرونی رسوم کا ایک سلسلہ تصور کیا جائے یا یہ کہ وہ بعید الفہم اسرار اور عقائد کا ایک قاعدہ و طریقہ ہے اور پابند شریعت کے معنی پوشیدہ طور سے سحر آمیز رازوں سے واقف ہونا ہے یا کسی خاص عقیدے کے ہر لفظ کا دُہرانا ہے تو اس کا عقلی نتیجہ یہ ہوگا کہ عام قوانین کی موجودگی جو بیرونی رسوم کا مکمل فیصلہ کرتی ہے اور وہ راہبجو انسان کو ان اسرار کی تعلیم دیتے ہیں اور وہ ایمان جو عقائد کے طریقوں کا فیصلہ کرتا ہے قدرتی وطبعی تصور کئے جائینگے اور خارجی اقتدار کا وجود لازم و واجب ہو جائیگا ۔

جہاں مذہب اِس تصور اور اس مقصد کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے وہاں خارجی اختیار مطلق بالکل لازم و واجب سمجھا گیا ہے ۔ لیکن اگر مذہب سے یہ مراد ہے کہ ہمارا تعلق و رشتہ خدا اپنے خالق اور اُن لوگوں کے ساتھ جن کے درمیان ہم بود و باش رکھتے ہیں بلکہ تمام دُنیا کی جانب صحیح و دُرست ہو اور مذہب کا مقصد انسان اور اس کے خالق کے درمیان اور خود انسان اور اُس کے ہمجنس انسان کے درمیان کامل موافقت اور آشتی و مصالحت کو قائم کرنا ہو تو اس وقت اس سوال کی نوعیت کہ مذہب میں اختیار کا کیا درجہ ہے بدل جائیگی ۔

درحقیقت اگر مذہب سے مُراد یہ ہے کہ اپنی ہستی بھول کر رضا بخدا ہو جائے اور خود غرضی کے عوض نفس کُشی کی پیروی کی جائے اور باہمی تعلقات میں بجائے دُشمنی دوستی کا رشتہ نہ قائم کیا جائے یعنی یہ کہ اگر

مذہب کا مفہوم زندگی کی جانب ایک نیا روحانی انداز ہو تو پھر مستبدانہ اختیار نہ صرف غیر ضروری ہی ہوتا ہے بلکہ نقصان دہ بھی۔ چونکہ مذہب اِن معنوں میں فضیلت کا عقلی مجزو نہیں بلکہ زندگی کی جانب ایک خاص انداز ہے۔ اِس لئے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ خارجی اختیار کے ذریعہ سے جبراً حاصل نہیں ہوسکتا چونکہ یہ انداز روح کا ایک خاص تجربہ ہے لہٰذا وہ فقط شخصی تجربہ کے وسیلہ سے ممکن الحصول ہے یعنی خود اپنی آنکھ سے دیکھکر قائل ہونے اور ذاتی عقیدہ کے ذریعہ سے۔ سچائی ضرور روح پر اثر پیدا کرتی ہے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ زندگی کو ایک نئی روشنی میں دیکھے اور زندگی کی جانب ایک نیا انداز پیدا کرے۔ حقیقی معنوں میں دیندار بننا رُوحانی بصارت اور ادراک اور ذاتی تجربہ کی رہنمائی سے قدم اُٹھانا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص بعض باتوں کو اپنے ذاتی ایمان سے نہیں بلکہ دوسروں کے بتلانے سے یقین کرلے یا شاید اس وجہ سے کہ وہ مدت مدید سے رائج ہیں۔ لیکن یہ دینی معاملات میں ممکن نہیں اس طرح وہ محض مذہبی دیوانہ بن جائیگا۔ مذہبی دیوانگی ایک قسم کی غلامی ہے۔ برعکس اس کے مذہب کے حقیقی معنے انسانی شخصیت کا کماحقہٗ جلالی پایہ تک پہنچنا ہے اور انسانی روح کا از سرِ نو پیدا ہونا اور انسان کا صحیح معنوں میں آزادی حاصل کرنا ہے۔ یہ پُر جلال حالت مذہبی دیوانگی کے ساتھ وابستہ نہیں ہوسکتی۔ جب مذہب کا مفہوم یہ ہو کہ اُس میں خارجی اقتدار ہونا ضروری ہے۔ جس سے لوگوں سے یہ توقع کی جائے کہ وہ آنکھیں بند کرکے اُس کے تابع ہو جائیں تو ذاتی ترقی رُک جائیگی کیونکہ اس طرح انسانی شخصیت دب جاتی ہے۔ انسانی شخصیت زندگی کے تمام حلقوں میں صرف آزاد خیالی اور دِلی یقین کے ذریعہ سے ترقی کرتی ہے

اور مذہب کے لئے بھی صرف ایک ہی طریقہ ہے ۔ اقتدار خارجی کا طریقہ انسان کو سریع الاعتقاد تو بنا دیتا ہے ۔ لیکن اُنہیں حقیقی ایمان کی نعمت نہیں مل سکتی ۔ ایمان صرف ذاتی تحریک و تشویش کا نتیجہ ہو سکتا ہے ۔

اس نقطۂ نگاہ سے مذہب کا مقابلہ فنون لطیفہ سے کیا جا سکتا ہے بعض اوقات لوگ کسی مشہور مصور مثلاً ریفیل (RAPHAEL) کی کسی نفیس تصویر کو دیکھکر یا بیتھوین (BEETHOVEN) جیسے مشہور ماہر علم موسیقی کی دلکش راگ کو سُنکر اُس کی تعریف کرتے ہیں ۔ اس لئے نہیں کہ تصویر کے دیکھنے یا راگ کے سُننے سے اُن کے دل میں کوئی خاص خوشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ۔ بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اوروں کو ایسا کہتے سُنتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ خود بھی بہت محظوظ ہوئے ہیں ۔ شاید مذہب کے معاملہ میں بھی ایسا ہی ہو ۔ اکثر لوگ نہایت جوش و سرگرمی کے ساتھ مذہب کے متعلق بحث مباحثہ کرتے ہیں اور مذہب کی حمایت کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ مذہب کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں یا اس لئے نہیں کہ اُن کی رُوح میں کوئی حقیقی اتحاد یا کوئی حقیقی میل ملاپ ہوتا ہے بلکہ فقط اس لئے کہ اُنہوں نے اپنے مذہبی معلموں سے ایسا سُنا اور سیکھا ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ نہ تو مذہب ہے اور نہ زہد و تقویٰ ۔ فی الحقیقت یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ریفیل کی مشہور تصویر ایک معمولی خاکہ سے بہتر ہے یا بیتھوین کا عمدہ راگ معمولی خانہ بدوشوں کے سنکھ سے بہتر ہے بحث و مباحثہ کرنا بالکل بے معنی ہوگا ۔ آدمی کو خود اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے اور اُس کے دل میں حظ زیبائی پیدا ہونا چاہیے

تاکہ وہ اُس تصویر کی خوبصورتی کو سمجھ سکے اور اُس راگ کی دلسوزی کی تعریف کرسکے۔ یہ ذاتی تجربہ اور اندرونی خوشی پر منحصر ہے۔ کسی کو زبردستی اس کا قائل کرانا ممکن نہیں اور اگر بالفرض کوئی اس طور سے اس کا قائل ہو بھی جائے تو یہ صریحاً ریاکاری ہوگی۔ اسی طرح مذہب میں بھی ہے۔ مذہب کسی کے دل میں زبردستی نہیں ڈالا جاسکتا۔ نہ ہی بیرونی طاقت کی مطلق العنانی کے زور سے کسی کو زبردستی اس کا قائل بنایا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا جبر روا رکھا جائیگا تو اس کا نتیجہ ریاکاری اور مذہبی دیوانہ پن ہوگا۔ اس لئے کہ مذہب شخصی تجربہ اور روح کا سوال ہے اور انسان اس تک فقط ذاتی تجربہ کی وساطت سے پہنچ سکتا ہے اور روحانی فہم و عقل کے ذریعہ سے اُس کو سمجھ سکتا ہے۔ حقیقی مذہب اور حقیقی زہد و تقوٰی حاصل کرنے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں۔

اس نقطۂ نگاہ سے حق کو پہچاننے کے لئے مذہب کا دار و مدار انسانی رُوح کی استعداد پر موقوف ہے۔ حق کی شناخت کرنے اور اس کے محسوس کرنے کے لئے انسان روحانی استعداد رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خواہ کسی حالت میں کیوں نہ ہو انسان کو ایک بیرونی اختیار اور قید کے تابع رکھنا اس کی بُنیادی استعداد کا منافی ہوگا جو انسانی شخصیت کا بیش بہا خزانہ اور اس کی شخصی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہے۔ لہٰذا سب سے اعلیٰ اور درست ترین بات یہ ہے کہ انسان کی روحانی استعداد پر جو اُسے حق کی پہچان کے لئے حاصل ہے بھروسہ کرتے ہوئے حق کو اُس کے سامنے پیش کریں۔ کیا آخر تعلیم کا یہی مقصد نہیں کہ ہم میں حق کے پہچاننے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ ورنہ اگر مدرسہ میں

استاد اختیار مطلق سے کام لے اور یُوں کہے "یہی حق الامر ہے ۔ اس لئے کہ مَیں کہتا ہوں اور چونکہ میں ایسا کہتا ہوں تمہیں اُسے قبول کرنا ہے"۔ اور وہ اپنے شاگردوں کو اس امر کا عادی نہ بنائے کہ وہ حق کی تلاش بذاتِ خود کریں تو وہ طوطے کی مانند فقط نقال پیدا کریگا ۔ جو بغیر سوچے سمجھے رٹ لیتے ہیں نہ زبردست دماغ اور نکتہ شناس عقلیں ۔ مذہب میں بھی یہی حال ہے ۔ انسانی طبیعت حق کو معلوم کرنے کی قابلیت رکھتی ہے ۔ مذہب کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو حقیقی انسان بنائے اور اُسے سرفراز کرکے کمالیت کے درجہ تک پہنچائے ۔ لہٰذا مذہب از بر نہیں کروایا جاسکتا اور نہ اقتدار خارجی کے زور سے قبول کروایا جاسکتا ہے ۔ اس طریقہ سے فقط کور باطن مذہبی دیوانے ترتیب پا سکتے ہیں ۔ مذہب اپنے مُدعا کو صرف اُسی وقت حاصل کرسکتا ہے جب انسان کی مرضی کو آزاد رہنے دیا جائے اور روح پر بھروسہ کیا جائے ۔ جبر سے آدمیوں کو مذہبی رنگ نہیں دیا جاسکتا ۔

اگر مذہب کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں الہامی کُتب مقدسہ ۔ انبیاء اور رُسل کے درجے تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ اس وقت کُتب مقدسہ احکام مطلق نہیں تصور کی جائیں جن کو ہمیں پڑھنا اور حفظ کرنا ہے ۔ جن کے اوامر اور احکام کی تعمیل ہم پر واجب و لازم آتی ہے ۔ بلکہ اُس حالت میں وہ ایک رُوحانی نور بن جاتی ہیں جو ہمارے افضل ترین جذبات پر اثر کرتی ہیں ۔ انبیاء اور رُسل متکبر حکام کی مانند نہیں رہتے جو ہمارے سر پر کھڑے ہوکر ہم پر حکمرانی کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہم کورانہ اُن کے حکم بجا لائیں بلکہ وہ

مخلص دوست بن جاتے ہیں جو زندگی کی کشمکش میں ہمارے رفیق اور ہمارے رہنما بننے کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ گو وہ ہماری مانند تکلیفوں اور مصائب کے بار کے نیچے دبے رہے تو بھی اُنہوں نے اپنی پاکیزگی اور جوانمردی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس سے الہامی کُتب اور انبیاء اور رُسل کی قدر کم نہیں ہو جاتی بلکہ برعکس اس کے یہ اُن کو ہماری شخصیت کے لحاظ سے زیادہ بلند پایہ پر رکھ دیتی ہے ۔جب وہ اس پایہ تک پہنچ جاتے ہیں جس کے وہ درحقیقت حقدار ہیں تو ہماری روحانی زندگی کے اعتبار سے اُن کی وقعت زیادہ ہو جاتی ہے۔

کتب مقدسہ کو ایک کامل شریعت کی کتاب تصور کرنا اسکے صحیح مفہوم کو سمجھے بغیر اپنے اعمال میں اُس کے الفاظ کی پیروی کرنے سے ہم اپنے اعمال کی ذمہ داری سے سُبکدوش ہو جاتے ہیں اور ساری ذمہ داری کو اُن پر رکھ دیتے ہیں اور اس طرح گو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہماری ضمیر کو ہمارے اُن اعمال کی نسبت جو ہم خود پسند نہیں کرتے تسلّی اور اطمینان ہوتا ہے لیکن اس سے ہماری روح گندہ ہو جاتی ہے اور ہماری شخصیت گر جاتی ہے۔ کیونکہ حقیقی زہد و تقوٰی یعنی روح کی تکمیل ہمارے اعمال اور ہمارے اخلاق کی نسبت شخصی ذمہ داری کے احساس کے ذریعہ سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

پھر اس نقطۂ نگاہ سے مذہب میں خُدا کے رُتبہ کے متعلق ہماری رائے بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اُس وقت خدا محبّت اور مہربانی کا سرچشمہ بن جاتا ہے نہ ظالم اور جبّار جو دُنیا کو اپنی طاقت قہاری کے باعث اپنی مرضی کے تابع رکھتا ہے۔ وہ ایک محبّت کرنے والا باپ بن جاتا ہے

جو ہر ایک انسان کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے نہ ایک ایسا حاکم جس کے اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جا سکتا۔ اس طریق سے خدا کے لئے ہماری محبت وتعظیم وتکریم کا سبب اُس کے غضب کا خوف اور اس کے احکام کی نافرمانی کے باعث سزا کا ڈر نہیں ہوتا بلکہ اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے دل و دماغ کو کامل یقین ہوتا ہے کہ حقیقی خوشی خدا کے ساتھ یگانگی ومطابقت سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنی فطرت میں خدا کی مانند ہے اِس لئے خدا ہمیں خاک اور پتھر سمجھ کر کسی مادی شریعت کے ذریعہ سے ہم سے مخاطب نہیں ہوتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ ہم کو ترغیب دیکر صراطِ مستقیم پر لائے اس کا سلوک ہمارے ساتھ یہ نہیں کہ وہ یہ چاہے کہ ہم بغیر حیل وحجت اس کی اطاعت کریں جیساکہ کوئی حاکم بہ جبر واکراہ کرائے۔ بلکہ محبت کے ذریعہ سے جیسے ایک محبت کرنے والا باپ اپنے بچوں سے کرواتا ہے۔ فی الحقیقت وہ چیز جو خدا ہم سے چاہتا ہے صداقت ہے نہ کورانہ اطاعت۔ حقیقی محبت نہ کہ غلامی۔ اس طور سے خدا کو قبول کرنے اور اُس سے رفاقت پیدا کرنے سے ہماری انسانی شخصیت کے خراب ہوجانے کے بجائے ہماری رُوحانی زندگی ایک اعلیٰ پایہ تک پہنچتی ہے اور ہماری شخصی آزادی کامل ہو جاتی ہے۔ خدا کے ساتھ ہمارے تعلق پیدا کرنے میں سب سے زیادہ خلوص نیتی کی ضرورت ہے کیونکہ حقیقی دوستی اور رفاقت کی پہلی شرط صدقدلی ہے۔ خدا ہم سے اَور کچھ طلب نہیں کرتا۔ ہماری مذہبی زندگی ہے متعلق اُس کے اختیار میں جبر کا عنصر نہیں بلکہ وہ اختیار دِلی اختیار رہے۔ مذہبی زندگی کی ترقی اَور کسی طرح ممکن نہیں۔

اِس نقطۂ نگاہ سے مسیح کی زندگی کا مطالعہ مذہبی علم کی صورت میں

کرنا نہایت اہم ہے۔ مسیح اور دیگر اسرائیلی دینی معلّموں میں مروجہ کتب مقدس یعنی تورات۔ زبور اور الہامی شریعت کی کتاب کے مطالعہ اور اُن کے رُوحانی مُعانی کو سمجھنے میں بڑا اختلاف تھا۔ بنی اسرائیل کے دینی معلم اپنی الہامی شریعت کا مطالعہ نہایت غور سے کرتے تھے اُسے ازبر کرتے۔ ہر ایک لفظ کو خوب پرکھتے ہر ایک حرف کی تشریح سے لیکن خود اُس کے رُوحانی معانی سے واقف نہ ہوتے تھے وہ اس کے کُل احکام کی کامل اطاعت پر اصرار کرتے تھے لیکن اس کے حقیقی معنی سے بے بہرہ رہتے۔ وہ ظاہرا رسوم کو بجالاتے لیکن اُس کے روحانی اُصول کی اہمیت کی جانب مطلق توجہ نہ کرتے پس وہ بظاہر مذہبی دیوانے اور نہایت متقی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن درحقیقت نہایت متکبر اور تنگ خیال تھے۔ وہ بظاہر تو خدا کی خدمت کرتے تھے لیکن باطنی طور پر وہ اپنی نفسانی خواہشات کے غلام تھے۔ وہ اپنی الٰہی شریعت کے دس احکام کی تعمیل کرتے تھے لیکن حریص اور بد اخلاق تھے۔ چونکہ وہ الٰہی شریعت کو اپنی زندگی کا اقتدار خارجی تصور کرتے تھے لہٰذا وہ یہ یقین کرتے تھے کہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے یہ کافی اور وافی تھا کہ اُن کے اعمال اس الٰہی شریعت کے مطابق ہوں اور اس خیال سے جو غرور اُن کے سروں میں سما جاتا تھا وہ اُنہیں ریاکاری کی جانب کھینچ لے جاتا تھا۔ فی الحقیقت بنی اسرائیل کے دینی معلم ایک عمیق مذہبی جنون میں پھنسے ہوئے تھے۔ اُن کی زندگیوں میں خلوص نیتی اور سچائی کا نام و نشان بھی نہ تھا اور وہ مذہب کے حقیقی مُعانی کے سمجھنے سے کوسوں دُور تھے۔ برعکس اس کے مسیح نے بنی اسرائیل کی الٰہی شریعت کو نہایت عزت و ادب کے ساتھ پڑھا لیکن وہ اس کے مُعانی کچھ اور سمجھتا تھا۔ وہ فقط الفاظ کو نہیں بلکہ رُوحانی اُصولوں کو زیادہ لازمی خیال کرتا

تھا۔ رسوم اور دستوروں کے طرز ادائیگی کو نہیں بلکہ اُن کے مقصد کو اور اس لئے وہ ان کے مطابق عمل کرتا تھا۔

مثلاً بنی اسرائیل اس حکم کو جو انتقام لینے کے متعلق ہے یعنی "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" لفظ بلفظ بجالاتے تھے اور اس پر تفصیلی بحث کرتے تھے مثلاً ایسے معاملات جہاں کسی شخص نے دُوسرے کا دانت توڑ دیا ہو اور خود اُس کے مُنہ میں کوئی دانت نہ ہو جو توڑا جائے اس کا فیصلہ الٰہی شریعت کے مطابق کیا ہونا چاہئے۔ لیکن مذہب کے بُنیادی اُصولوں سے بالکل بے پروا تھے۔ برعکس اس کے مسیح نے یہ فرمایا کہ ان احکام کا اصل مطلب انتقام کے خیال کو محدود بلکہ بالکل رفع کرنا ہے۔ اور اُس نے خود اپنی زندگی کا دستور العمل یہی قرار دیا۔

یہودی معلم عہدِ عتیق کے اس حکم یعنی "تُو خون نہ کر" کی پُوری تعمیل کرتے تھے اور خون کرنے کو خلاف قانون سمجھتے تھے لیکن باوجود اس کے وہ یہ نہ مانتے تھے کہ اپنے ہم جنس انسان سے عداوت رکھنی اس حکم کے متناقض تھی۔ لیکن مسیح نے ان احکام اور فرمانوں کے حقیقی مُعانی کو سمجھاتے ہوئے یہ فرمایا کہ اپنے بھائی کو گالی دینا اور اپنے دل میں کینہ رکھنا خُون کرنے کے مترادف ہے۔

اسرائیلی عہدِ عتیق کے مطابق خدا کے نام کی قسم تو نہ کھاتے تھے لیکن وہ آسمان اور زمین کے نام کی قسم کو بُرا نہ جانتے تھے۔ اس طور سے وہ اپنے روزانہ کام میں جُھوٹی قسمیں کھاتے تھے اور اس بات کا یقین رکھتے ہوئے کہ وہ الٰہی شریعت کے فرمانوں اور قواعد کے خلاف عمل نہیں کرتے اُنہیں مطلق افسوس نہ ہوتا تھا۔ لیکن برخلاف اس کے مسیح نے یہ فرمایا کہ کبھی

قسم کی قسم کھانا گناہ ہے اور تمہارے الفاظ فقط "ہاں" اور "نہ" ہونے چاہئیں۔
الہٰی شریعت کے مطابق وہ نماز پڑھتے۔ روزہ رکھتے۔ خیرات دیتے
اور ایسا کرنے سے اُن کے دل میں ایک قسم کا مذہبی غرور پیدا ہو جاتا تھا۔
مسیح نے فرمایا کہ تمہاری نماز سچے دل سے ہونی چاہئے اور "جب تو خیرات
کرے تو جو تیرا دہنا ہاتھ کرتا ہے اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے" پس
یہودی معلمانِ شریعت تو لفظ اور حرف کا خیال رکھتے ہوئے مذہبی
دیوانہ پن سے کام لیتے تھے۔ لیکن مسیح نے اصل اور حقیقی معانی کی اہمیت
کا خیال رکھا۔ عہدِ عتیق مسیح کے نزدیک ایک ایسی کتاب نہ تھی جو فقط الفاظ
حروف۔ بیرونی احکام اور فرمانوں سے معمور تھی جن کی اطاعت لازم ہوتی
تھی بلکہ وہ ایک رہبر کی مانند تھی جس کو اس کے حقیقی اور روحانی معنی کے
سمجھے جانے کے بعد دل اور ایمان قبول کرتے ہیں۔

مسیح اور یہودی عالمانِ شریعت کے درمیان مذہبی طریقۂ تعلیم
میں ایک گہرا فرق تھا۔ یہودی دینی معلم خیال کرتے تھے کہ پوشیدہ معانی
سے واقفیت حاصل کر کے وہ زہد و تقویٰ کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ گئے
ہیں۔ وہ لوگوں کو مذہبی تعلیم دیتے ہوئے یہ کہتے تھے "مذہبی مسائل کچھ اسرار
اُمور ہیں جو تمہاری عقل سے بالاتر ہیں۔ اُن کو فقط ہم ہی سمجھ سکتے ہیں لہٰذا
جو کچھ ہم تم کو سکھاتے ہیں اسی کو قبول کرو" اور اس طور سے لوگوں
سے کورانہ تقلید کی توقع رکھتے تھے۔ مسیح کے خیال تک میں ایسی بات
کبھی نہ آئی تھی۔ اُس نے لوگوں کی عقل اور اُن کے فہم پر اثر کیا اور مذہبی
دیوانگی اور ریاکاری کی بیخکنی کرتے ہوئے اپنے پاک خیالات کا اظہار کیا۔
یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مسیح نے اپنے کلام کی مقبولیت کے لئے یہ نہ فرمایا۔

"میں نبی ہوں اور خدا کا رسول ہوں یا میں وہ ہوں جس کی بہت پیشینگوئی کی گئی تھی پس میرے کلام کو قبول کرو۔" اس کو ان الفاظ کی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔ اُس نے تمام حقائق قدرتی اور پاک طریقہ سے لوگوں کو سکھائے اور اُس نے لوگوں کو یہ صلاح دی کہ پاک دلی سے اُس کے کلام پر غور کریں۔ اُس نے فصیح اور بلیغ تقریروں کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنی جانب نہ کھینچا کیونکہ اُسے یہ معلوم تھا کہ کلام کی فصاحت لوگوں کو کھینچ تو لاتی ہے لیکن اُن کے دلوں کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اُس نے اپنے سادہ اور پاک کلام سے لوگوں کی رُوحوں پر اثر کیا۔ یہ صحیح ہے کہ مسیح اپنی تعلیم کے آغاز میں آسمان پر کوئی نشان دکھا کر یا کسی بڑے معجزے کے ذریعہ سے اپنے آپ کو ظاہر کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اس طریقہ کو اختیار نہ کیا۔ بلکہ جب بعض نے ایسا نشان طلب کیا تاکہ وہ اُس پر ایمان لے آئیں تو اُس نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ کوئی بڑا معجزہ ضرور ان کو حیران و متعجب کر دیتا لیکن وہ محبت و رحمت کے خیال کی بنیاد نہ قائم کرتا۔ مسیح کی یہ آرزو نہ تھی کہ وہ عجیب و غریب معجزے دکھا کر اپنے گرد انبوہ غفیر جمع کر کے اپنے معتقدوں کا شمار بڑھائے بلکہ یہ کہ وہ لوگوں کی ضمیر کو بدل ڈالے اور اُنہیں نئی زندگی عنایت کرے جو محبت و رحمت سے معمور ہو اور اُس کا فقط ایک ہی طریقہ تھا یعنی دل پر اثر کرنے سے۔ مسیح کے معجزوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنی محبت اور اپنی شفقت کو لوگوں پر ظاہر کرے اور اس طرح اُن کے دل میں بھی محبت کے جذبات پیدا

کرے اور اسی وجہ سے مسیح لوگوں کے لئے بیرونی اختیار کا علم لے کر نہ اُٹھا۔

مسیح اکثر اوقات یہ الفاظ استعمال کرتا ہے "خدا کی بادشاہی" اور بتاتا ہے کہ وہ خدا کی بادشاہی کی خبر دینے آیا ہے۔ اس سے اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ کسی ایسے عالم ارواح میں داخل ہو جاوینگے جو زمین کے اُوپر ہے اور جہاں وہ ایسی زندگی بسر کرینگے جو غم و مصیبت سے خالی ہو۔ بلکہ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ لوگ اپنے روزانہ کار و بار میں خدا کو یاد رکھیں اور اِس دُنیا کو خدا کا مسکن تصور کریں اور سلطنت الٰہی کے نیچے برادرانہ طریقہ سے مل جُل کر زندگی بسر کریں ۔ خدا کی بادشاہی کے معنے ہیں اِسی پُرانی دُنیا میں رہتے ہوئے زندگی کو ایک نئے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا۔ اپنے ہمسایوں سے ملنا جُلنا اور اُن کے ساتھ محبت اور خلوص نیتی سے پیش آنا۔ مصائب کے وقت پست ہمت نہ ہونا بلکہ اُن مصائب اور تکالیف میں نئی اخلاقی فتح کے موقعوں کا پانا۔ القصہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس دُنیا میں زندہ رہ کر گویا نئی ہستی کا جامہ پہنیں۔ زندگی کے اس اعلیٰ پایہ پر انسان جبریا قہر الٰہی کے خوف سے یا فصیح کلامی یا بہ الفاظِ دیگر بیرونی اختیار کے زور سے نہیں پہنچایا جاسکتا بلکہ اس کے لئے خلوص نیتی سے لوگوں کے ساتھ محبت کرنا اور اُن کے لئے اپنی جان قربان کرنا اور اُن کو ایک نئی زندگی دکھا کر محبت اور نرمی سے انہیں اُس کی جانب کھینچنا ضرور ہے ۔ یہی مسیح کی طاقت کا راز ہے اور اُس نے لوگوں کو اِسی طریقہ سے اپنی جانب کھینچا ہے ۔ اس کی طاقت ایک غیر معمولی اختیار کی تحکمانہ طاقت نہ تھی وہ ایک خلوص

نیت اور پاک دل دوست کی قائل کرنے والی طاقت تھی - وہ
ایک مستبدانہ طاقت نہ تھی بلکہ ایسی طاقت جو دل پر اثر کرتی ہے۔
یہ صاف عیاں ہے کہ اس لحاظ سے مسیح مذہبی تعلیم میں
ایک اہم مرتبہ رکھتا ہے وہ اس امر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے کہ گو وہ کامل
اختیار کا مالک تھا تو بھی اُس نے اس کے استعمال سے پرہیز کیا
اور یوں لوگوں پر ناجائز قابو نہ پایا وہ ہر حالت اور ہر موقع پر محبت
اور سچائی کے ذریعہ سے انسان کے دل و دماغ پر اثر کرتا تھا۔ مذہب
کے دائرے میں مسیح کا حیرت انگیز اختیار اسی میں پایا جاتا ہے۔
پس مذہب میں اور کونسا غیر فانی اقتدار و اختیار موجود ہوسکتا ہے
ممکن ہے کہ کسی وقت یہ کامل فصاحت کسی اور کامل تر فصاحت
کی وجہ سے فراموش ہو جائے۔ زمانہ میں تبدیلی واقع ہوتی جاتی ہے
لہٰذا کوئی بہتر شریعت اگر اس سابق شریعت کے اقتدار کو منسوخ کر
دے۔ شاید کوئی ایسا وقت آجائے جب جدید عجائب کے مقابلہ میں
قدیم معجزات کی کوئی قدر و وقعت نہ رہے لیکن سلامتی اور حق کا اقتدار
ہمیشہ برقرار رہیگا۔ حق کے اقتدار سے زیادہ کوئی اور اقتدار مؤثر نہیں
اگر مذہب کا مقصد یہ ہے کہ مصیبت زدوں کو خوشی عنایت کرے۔
مظلوموں کو دلیری بخشے۔ ناامیدوں کو اُمید عطا فرمائے اور وہ جو گناہ
کی قید میں گرفتار ہیں اُن کو خلاصی بخشے۔ ظالموں کو رحمدل بنائے۔
بے انصافوں کو خود انکار بنائے اور ستمگروں کے دل کو محبت سے معمور
کردے یا بہ الفاظِ دیگر انسان کو حقیقی انسان بنائے اور اس دُنیا کو
ہمارے لئے ایک نیا عالم بنادے تو اُس وقت مذہب میں حق۔

اخلاص۔ حلم اور محبّت کے اقتدار کے سوا اَور کوئی اقتدار نہ ہو۔

پس اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مذہب کا یہ اندازہ نہ ہونا چاہیئے کہ اُسے ایسے قواعد و قوانین کا مجموعہ سمجھیں جن کی کورانہ اطاعت لازم و واجب ہے یا مذہب کو جابرانہ اقتدار اور غلامی تصوّر کریں اور اِس طور سے اُس کے مخالف ہو جائیں۔ بلکہ برعکس اس کے مذہب کو زندگی کا حقیقی معیار سمجھیں اور روشنضمیری سے اُن اُصول کا ملاحظہ کریں جو مذہب زندگی کے لئے پیش کرتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان میں حق کے لئے دِلی اُنس کا پایا جانا ایک اعلیٰ صفت ہے۔ اور مذہب کا صحیح اندازہ کرنا یہ ہے کہ صدقدلی اور اخلاص سے اس کی جانب متوجہ ہوں۔ مذہب کا اعلیٰ ترین مفہوم حق پرست ہونا اور زندگی کے لئے حق کو اختیار کر لینا ہے۔ اس حالت میں مذہب میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو ہمارے لئے کسرشان یا ہماری حیثیت کے خلاف ہو بلکہ وہ کامل انسانیت کی ایک صورت ہے۔ پس ہر انسان مذہب دوست ہوسکتا ہے کیونکہ مذہب ہماری انسانیت کا مطالبہ ہے۔
